سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ ع ۱۲۹

ابو الاعلیٰ مودودی کا اسلامی نظریۂ سیاست

از

مفکرِ یگانہ مولانا سید اختر علی صاحب تلہری مدظلہ

maablib.com

مطبوعہ
سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت چار آنہ
خرچہ ڈاک ایک آنہ

تعارف

سوادِ اعظم کے موجودہ مفکّرین میں جناب ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو خاص خصوصیت حاصل ہے، ان کا خاص غور وفکر کا مرکز زیادہ تر اسلامی نظریۂ حکومت رہا ہے، اسمیں وہ اپنی آزادی ضمیر سے غور وفکر کی رو میں اکثر حق سے بہت قریب بھی آجاتے ہیں مگر اپنے تقلیدی رجحانات اور قومی تصورات کی لاشعوری تحریک سے پھر وہ دور چلے جاتے ہیں! اسی موضوع پر اُن کی ایک تحریر کا مفکر یگانہ مولانا سید اختر علی صاحب قبلہ تلہری نے باریک نگاہی کے ساتھ جائزہ لیا ہے، اور اس ذیل میں ضمناً بہت سی وہ حقیقتیں بیان ہوگئی ہیں جنکا پیش نظر رکھنا اس سلسلہ میں ضروری ہے،

امید ہے کہ افراد قوم اس رسالہ کی صحیح اہمیت کو محسوس کرینگے اور اس سے بہرہ مند ہونگے، والسلام

خادم ملت سید ابن حسین نقوی
آنریری سکریٹری

فروری ۱۹۵۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید ابو الاعلیٰ مودودی موجودہ دور میں اسلامیات کے ممتاز ترجمان ہیں اور انھوں نے اسلام کے بعض اہم تمدنی مسائل کی توضیح و تشریح کامیاب عنوان سے کی بھی ہے لیکن اس طرف کچھ عرصہ سے انھوں نے اسلامیات کی ترجمانی میں خاص فہم کے متقضیات: اجتہاد سے کام لینا شروع کیا ہے جسے ہم صرف راہبانہ انداز کی تقدس پسندی ہی کہہ سکتے ہیں۔ آپ کے ان جدید اسلامی نظریات کی اہم کڑیاں "اسلام کا نظریۂ سیاسی" اور "راہ عمل" وغیرہ میں ہیں۔

ان رسائل میں جناب مودودی نے اپنے جدید سیاسی نظریے کی تفسیر کیلئے جو عنوان اختیار کیا ہے وہ "استدلالی" سے زیادہ "خطابی" ہے۔ جناب ممدوح کی تحریروں کا ایک نمایاں نقص یہ ہے کہ "خطابت" کے غیر معمولی بہاؤ کے ہنگامے میں منطقی تنظیم کا سر رشتہ گم ہو جاتا ہے اس لیے اس نتیجہ کا خالص علمی حیثیت سے بشتر تشفی بخش نہیں نکلتا۔

اس میں تو شک نہیں کہ جناب مودودی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ ہمیں باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟

مگر سوال یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظریے کی تعیین میں اس اصول پر خود مودودی صاحب نے کہاں تک عمل کیا ہے؟ کیا خود انھوں نے پہلے سے اپنے "فکری رجحانات" کے تحت ایک نظریہ قائم نہیں کرلیا اور پھر کسی نہ کسی طرح اسے اسلام کے سر عاید نہیں فرما دیا؟

ذیل کی سطروں میں اسی سوال سے بحث کی جائے گی

جناب مودودی نے "اسلام کے سیاسی نظریہ" کو اسلامی نظریات کی اساس بتاتے ہوئے انبیاء علیہم السلام کے مشن کا تذکرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں آپ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے:۔

"قرآن میں ایک جگہ نہیں کثیر مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین جن سے انبیاء کی لڑائی تھی اللہ کے منکر نہ تھے۔ ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے، وہی پانی برساتا ہے، وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں گے"

اس خالص تاریخی دعوے کے ثبوت میں مودودی صاحب نے قرآن کریم کی حسب ذیل آیتیں لکھی ہیں:

(۱) قل لمن الارض ومن فیہا ان کنتم تعلمون سیقولون للہ قل افلا تذکرون۔ قل من رب السموات السبع ورب العرش العظیم سیقولون للہ قل افلا تتقون۔ قل من بیدہ ملکوت کل شیء وہو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم تعلمون سیقولون للہ قل فانی تسحرون (المؤمنون ۵۰)

ولئن سالتہم من خلق السموات والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ فانی یؤفکون ولئن سالتہم من نزل من السماء ماء فاحیا بہ الارض من بعد موتہا لیقولن اللہ (العنکبوت)

ان آیات کے لکھنے کے بعد مودودی صاحب نے فرمایا ہے:۔

"ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اس کے خالق ہونے اور مالک ارض و سما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے لہذا ظاہر ہے کہ انہیں باتوں کے منوانے کیلئے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب پوچھئے کہ انبیاء کی آمد کس لیے تھی اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟ قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاء کہتے تھے جو تمہارا اور زمین آسمان کا خالق ہے

maablib.com

وہی تمہارا رب اور اللہ بھی ہے اس کے سوا کسی کو اللہ اور رب نہ مانو گے دنیا اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہ تھی"

استدلال کی پہلی منزل طے کرنے کے بعد مودودی صاحب نے رب الہ اور معبود کے معنی بتائے ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور کسی دوسرے شخص کی عبادت نہ کی جائے یعنی غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہے لیکن کفار و مشرکین اس عبودیت کی زندگی کو اللہ سے خاص نہیں کرتے بلکہ بہت سے انسانوں کے لئے بھی عبودیت کی یہ زندگی وقف کر دیتے ہیں، یہیں سے تمام خرابیاں پھوٹتی ہیں۔ اسلام اسی فتنہ اور فساد کی جڑ پر تیشہ لگانا چاہتا ہے۔ اس کی ریاست کا تخیل اسی محور کے اردگرد گھوم رہا ہے"

جناب مودودی کے اس استدلال کا ہر جزو منطقی احتیاطات سے بے نیاز ہے انکا غور کو اس دلیل کا تحلیل و تجزیہ کرنے پر صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک تاریخی چیز کے ثابت کرنے کیلئے جن واضح شہادتوں کے پیش کرنے کی ضرورت تھی ان سے قطع نظر کرتے ہوئے ایک نظریہ اسلام کے سر عاید کر دیا ہے۔

جناب مودودی کا یہ دعویٰ کہ تمام کفار و مشرکین کو یہ تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق بھی ہے حیرت خیز ہے۔

اس وقت اور انبیا کو تو جانے دیجئے۔ خود جناب سرور کائنات صلعم کی بعثت کے وقت مختلف مذاہب موجود تھے۔ عرب کی تاریخ اس سچائی کی پوری قوت کے ساتھ شہادت دیتی ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"عرب کے مذاہب ایک دوسرے سے الگ اور مختلف قسم کے تھے۔ کچھ تو فنا کرنیوالے دہر کے قایل تھے اور کچھ خالق عالم کا اقرار کرتے تھے لیکن بعثت و نشر کے قایل نہ تھے کچھ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ کچھ یہودی تھے، کچھ نصرانی"

اس وقت سامنے سب ایک ہی مذہب ہوتا تھا اس لئے اسی کا اقتباس دے دیا گیا ورنہ حقیقت

عرب کی تمام تاریخی کتابوں میں مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر فہم سلیم کی طرف رجوع کی جائے اور اپنے اردگرد کے مشاہدوں سے نتیجہ نکالا جائے تو قدم قدم پر اس کا ثبوت مل سکتا ہے کہ بہت سے انسانی دماغ اس قسم کے ہوتے ہیں جن میں کسی طرح خدا کے وجود کا تصور سماتا ہی نہیں۔ انھیں خدا کے وجود کا سرے سے انکار کرنا ہی عقل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ انھیں ارباب مذاہب کے "اللہ" کا تسلیم کرنا عقلی سفاہت کا نشان دکھائی دیتا ہے، ایسے لوگ رسولؐ کے زمانہ میں بھی موجود تھے۔ ان سے پہلے بھی تھے۔ ان کے بعد میں بھی رہے ہیں اور اب بھی ہمارے آس پاس ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، علم کلام کی کتابوں میں رسول و تابعین رسولؐ کے زنادقہ وملاحدہ سے اس سلسلہ کے مناظرے بکثرت پائے جاتے ہیں "فکری تنزل و نظری رجعت پسندی" کی حد یہ ہے کہ باوجودیکہ رسول کریم نے توحید کے نہایت ہی گرانقدر تنزیہی سبق اپنی اُمّت کو دیے تھے لیکن انھیں میں ایسے افراد بھی ملتے ہیں جو خالقِ عالم کی تجسیم کے قایل ہیں یا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خالق عالم اپنی برگزیدہ مخلوق کے قالبوں میں حلول کرتا ہے۔

اس صورت حال سے بچنے کے لیے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ایسے لوگوں سے انبیا کو کوئی تبلیغی تعلق نہ تھا، ان کا جھگڑا تو صرف ان کفار و مشرکین سے تھا جو زمین و آسمان کے خالق (اللہ) کو رب و معبود نہیں مانتے تھے تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سرور کائناتؐ یا دوسرے اولوالعزم پیغمبروں کا بھی تبلیغی مشن نہایت تنگ و محدود تھا اور ان کی ہدایت صرف مخصوص قسم کے کفار کیلئے مخصوص تھی اور ان کفار کو جن کی عقلی نظر الہیاتی مسایل کے متعلق کوتاہ تھی انبیا کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کا کوئی براہ راست موقع نہ تھا۔ اولوالعزم پیغمبروں کی تبلیغی بعثتوں کے متعلق یہ خیالات ان کی پیغمبرانہ عظمت کے منافی ہیں۔ اگر جناب مودودی نے کفار و مشرکین کے بعد یہ قید "جن سے انبیا کی لڑائی تھی" اسی غرض سے بڑھائی ہے اور وہ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ انبیا کی لڑائی خاص قسم کے کفار سے تھی اور انؑ کے علاوہ جو دوسرے قسم کے کفار تھے ان سے انبیا کی لڑائی نہ تھی تو یہ نہایت دلچسپ بات ہوگی اصل تو یہ ہے کہ انبیا کی لڑائی ان سب سے بھی

جو الہیاتی و تمدنی جادۂ حق سے منحرف تھے۔ ان کا جھگڑا تمام کفار سے تھا وہ بلا استثنا تمام ضالین و منکرین کو سیدھے راستہ پر لانا چاہتے تھے اور ان کی ہدایت و ارشاد کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہوا تھا۔

واضح رہے کہ قرآن مجید کے اکثر مقامات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک کہ تاریخ کا پس منظر پیش رکھتے ہوئے ان کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ مودودی صاحب سے یہی غلطی ہوئی ہے کہ وہ تاریخی پس منظر کو ان مقامات پر نظر انداز کر گئے ہیں۔

جناب مودودی نے جن آیتوں سے اپنے مطلب پر استدلال کیا ہے وہ ان کے لیے مفید نہیں ہیں۔

ان آیات میں جن کفار کا ذکر ہے وہ بیشک مخصوص قسم کے ہیں جیسا کہ سابق آیات سے ظاہر ہے ان میں پہلے ان کفار کا یہ شبہ درج کیا گیا ہے کہ "جب ہم مر جائیں گے اور ہڈیوں اور مٹی میں منتقل ہو جائیں گے تو کیا پھر سے ہم زندہ کیئے جائیں گے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کفار اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو خدا کا معترف تو تھا لیکن بعثت (پھر سے زندہ ہونے کا) منکر تھا۔ مودودی صاحب نے جو آیتیں اپنے مطلب کے اثبات کے لیئے نقل کی ہیں وہ انھیں کفار کے خیال کی رد سے تعلق رکھتی ہیں جو پھر سے زندہ کیئے جانے کے منکر تھے یا جو خدا کو مانتے تھے لیکن بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اس کا سبب یہ بیان کرتے تھے کہ اس سے خدا کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔

معتبر تفسیروں میں اس کی تشریح بھی موجود ہے۔ ایسی صورت میں ان آیتوں سے یہ نتیجہ نکالنا کسی منطق کی بنا پر درست نہیں ہو سکتا کہ اس وقت ایسے کفار موجود نہ تھے جنھیں اللہ کے ہونے اور اس کے خالق ارض و سما ہونے میں شک تھا، خود قرآنی آیتوں سے اس خیال کی رد ہوتی ہے۔

اس کے ماسوا یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ سرور کائناتؐ خاتم المرسلین ہیں ان کی تعلیمات تا قیامت ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیئے ہیں ایسی حالت میں اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ اس وقت اللہ کے منکر کافر موجود نہیں تھے بلکہ رسولؐ کا مقابلہ جن کافروں سے تھا وہ سب کے سب اللہ کے قائل تو تھے مگر اس کو اپنا

رب اور معبود ماننے کے لیئے آمادہ نہیں تھے تو اس کا جواب کیا ہوگا کہ آنحضرت کے بعد اب اس زمانہ میں ایسی قومیں موجود ہیں جو خدا کے وجود کا اقرار نہیں کرتیں۔ اسلام کا تخاطب تو اپنی عالمگیری حیثیت کی وجہ سے ان سے بھی ہوگا۔ انھیں کیونکر وہ رسولؐ یا وہ مذہب نظر انداز کرسکتا ہے جو ہر زمانے کیلئے اور ہر قوم کیلئے ہدایت، وارشاد کا سرچشمہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اسلام کا جس نے حکیمانہ مطالعہ کیا ہے اس کے لیئے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ اس کا "مجادلہ حسنہ" عام تھا۔ آفاق گیر تھا اور ہے۔ اس کی زد میں کفار کی تمام صنفیں آتی ہیں۔ اس کا فرق کئے بغیر کہ وہ صانع عالم کے ماننے والے تھے یا انکار کرنے والے۔ اس کے ثبوت میں اسلامی تاریخ سے ایسے کثیر شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ انبیا اور ان کے نائبین نے اپنی تعلیمات سے زندیقوں اور ملحدوں کے دماغوں سے الہیاتی نظر کی کجی دور کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہ البتہ سچ ہے کہ اس کے علاوہ بھی دوسری عقلی و اخلاقی و معاشرتی و تمدنی بیماریوں کا دفع کرنا ان کے لائحہ عمل میں داخل تھا۔ مودودی صاحب نے انسانیت کی روح کے لیئے جس بیماری کو ام الامراض سمجھا ہے اور جس کے تنہا ازالہ کو انبیا کا واحد مشن قرار دیا ہے وہ بھی اپنے اکثر مظاہر میں اخلاقی و تمدنی بیماری ہی قرار پاتی ہے اور اس لیئے اس کا ازالہ بھی انبیا کے فرائض میں داخل ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس سے اہم بیماریاں اور بھی ہیں۔

اس تقریر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جناب مودودی کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ جن کفار و مشرکین سے انبیا کی لڑائی تھی وہ سب کے سب اللہ کو خالق عالم ماننے والے تھے، اب آیئے جناب مودودی کے استدلال کے دوسرے حصہ پر بھی نظر کرلی جائے۔ مودودی صاحب نے ارشاد کیا ہے کہ یہ تمام کفار و مشرکین اللہ کو خالق و مالک ارض و سما ماننے کے بعد انبیا کے اس دعوے کو نہیں مانتے تھے کہ "جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے اور تمہارا رب اور اللہ بھی ہے اس کے سوا کسی کو اللہ اور رب نہ مانو"۔ اس تشریح کے بعد فاضل موصوف نے "اللہ۔ معبود اور رب" کے معنی بتائے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے اشارات کا خلاصہ یہ ہے:۔

"اللہ کے معنی معبود کے ہیں۔ معبود کا مادہ عبد ہے۔ عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے خدمت کے لیے کھڑا ہونا۔ احترام میں ہاتھ باندھنا۔ اعتراف بندگی میں سر جھکانا فرمانبرداری میں دوڑ دھوپ کرنا جس کام کا اشارہ ہو اُسے بجالانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ عبادت کا اصلی مفہوم ہے اور آدمی کا معبود حقیقت میں، وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح سے کرتا ہے۔ اسی طرح رب کے معنی پرورش کرنے والے کے ہیں اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرماں برداری کی جاتی ہے لہذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے۔ آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے جس سے عزت و ترقی و امن کا خواہاں ہو جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے وہی اس کا رب ہے" ان تمام تشریحات کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس قسم کے اللہ معبود اور رب بننے کی آرزو انسانوں ہی کے دلوں میں نشوونما پاسکتی ہے۔

"اس قسم کی ہوسِ خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے اس لیئے وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے پاس فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں سو وہ ان سے کام لے کر کسی روح کسی دیوتا کسی قبر کسی سیارے کسی درخت کو اللہ بنا دیتے ہیں"۔ فاضل مودودی نے استدلال کے اس حصہ میں خطابت سے بہت سے زیادہ کام لیا ہے

غالباً فاضل موصوف اسے تو ضرور تسلیم کریں گے کہ قرآنی الفاظ و عبارات کے سمجھنے کیلئے اُس وقت کے عربی زبان و محاورات پر عبور کی ضرورت ہی کیونکہ قرآن کریم عربی زبان میں ہے اس لیئے کسی خاص نظریے کے ثابت کرنے کیلئے اپنی طرف سے الفاظ کے معانی اور آیات کے مفاہیم معین کر دینا دیانت تحقیق کے منافی ہے۔ اگر فی الحقیقت ہمیں قرآن کریم اور معتبر احادیث سے کسی چیز کو سمجھنا ہے تو پھر لغات عرب کے متعلق اُس وقت کے

تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے صحیح صحیح مفاہیم و معانی متعین کرنا چاہیے۔ ان چیزوں کا مطلب سمجھتے وقت ہمیں اس سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے کہ اب دنیا کا معاشرتی اصول و قوانین کے متعلق کیا نقطۂ نظر ہے یا مابعد الطبیعیاتی و فلکیاتی حقائق کے بارے میں اب انسانی تحقیق کا قدم کس منزل میں ہے؟ کیونکہ اگر ان سے متاثر ہو کر قرآن کی ترجمانی کی گئی تو یہ نہ تو اسلامی حیثیت ہی سے کوئی پسندیدہ چیز ہوگی اور نہ آزاد علمی حیثیت ہی سے ان ترجمانیوں کو کوئی علمی اہمیت حاصل ہو سکتی ہے نئے نئے خیالات و نظریات سے مرعوب ہو کر اگر انکے سانچہ میں قرآن مجید کے مطالب ڈھالنے کی کوشش کی گئی تو حقیقتاً اسلامی خیالات کیا ہیں، اس کا پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ صحیح اسلامی خیالات کی نشر و اشاعت سے جو ہماری اصلاح کا فایدہ ہے وہ بھی اس طرز عمل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو مذہبی خسارہ ہوا لیکن جو لوگ مذہب سے وابستہ نہیں ہیں انکے لئے ان غیر مناسب غلط قسم کی ترجمانیوں کی وجہ سے مختلف خیالات کے "صحیح ارتقائی سلسلہ" کی کڑیوں کا دریافت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

اس تقریر کا مدعا یہ ہے کہ ہم قرآن کے معانی و مفاہیم متعین کرتے وقت لغات عرب کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ہمارے لیئے اس کا دیکھنا ضروری ہے کہ ان الفاظ کا مفہوم اُس وقت کی عربی زبان میں کیا تھا؟ اس لیئے مناسب یہ ہے کہ مودودی صاحب کے خیالات کا جائزہ لینے سے پہلے متعلقہ لغات کے ذریعے یہ تحقیق کرلی جائے کہ ان الفاظ کے حقیقتاً مفہوم کیا ہیں؟

رب اللہ معبود اور خدا

صاحب کشاف نے لفظ "اللہ" سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے (واضح رہے کہ علامہ زمخشری صاحب کشاف کی حیثیت نہ صرف بحیثیت ایک مفسر بلکہ بحیثیت ایک امام لغت کے بھی بہت زبردست ہے)

والالٰہ من اسماء الاجناس کالرجل والفرس اسم یقع علی کل معبود بحق او باطل ثم غلب علی المعبود بحق کما ان النجم اسم لکل کوکب ثم غلب علی الثریا وکذٰلک السنۃ علی عام القحط

إلہ۔ اسمائے اجناس میں سے ہے جیسے رجل (مرد) فرس (گھوڑا) یہ وہ اسم ہے جس کا اطلاق ہر معبود پر ہوتا تھا خواہ وہ حق ہو یا باطل پھر اُس کا استعمال معبود برحق ہی کیلئے ہونے لگا جس طریقہ سے "النجم" ہر ستارے کا نام ہے لیکن اب "ثریا" ہی کو کہتے ہیں اسی طریقہ سے "السنۃ" کا لفظ ہے جس کا اب استعمال قحط کے سال پر ہوتا ہے "البیت" کی بھی یہی حالت ہے۔ اس کا استعمال اب خانہ کعبہ ہی کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔

دوسری لغت کی کتابوں میں بھی یہی چیز ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں "معبود" کے معنی پر بھی غور کر لینے کی ضرورت ہے۔ عام عربی لغت کی کتابوں میں عبادت کے معنی طاعت کے ہیں۔ "عبد اللہ" کے معنی یہ بتائے گئے ہیں۔

"وحدہ وخدمہ وخضع وذل فاطاع لہ" یعنی اُسے ایک مانا۔ اس کی خدمت کی اس کے سامنے عجز و انکسار سے کام لیا اور نتیجہ میں اس کی پرستش کی۔ رب کے معنی بتاتے ہوئے بیضاوی نے لکھا ہے "ولا یطلق علیٰ غیرہ تعالیٰ الا مقیداً"، اللہ کے علاوہ جب کسی اور پر اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا تو کسی قید کے اضافہ کے ساتھ۔

الفاظ زیر بحث کے ان لغوی معنوں پر غور کرنیکے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ استعمال میں الہ۔ اللہ اور رب کا مصداق وہی ایک ذات واجب الوجود ہے اس لئے آیہ "ما علمت لکم من الہ غیری" (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمھارا کوئی اور خدا ہے) اور آیہ "لئن اتخذت الٰھا غیری لاجعلنک من المسجونین (اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو خدا اقرار دیا تو میں تجھے جیل بھیج دوں گا) میں "الہ" سے مراد وہی معبود برحق یعنی اللہ ہے۔

حضرت موسیٰ کا فرعون سے جھگڑا

فرعون وغیرہ سے حضرت موسیٰ کا صرف یہی جھگڑا نہیں تھا کہ وہ حضرت موسیٰ سے بھی اسی کا طلبگار تھا کہ اللہ کو فاطر السموٰت ماننے کے بعد اپنی تمام اطاعتوں کا مرکز فرعون کو قرار دے لیا جائے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ فرعون اپنے دل میں

اپنے اللہ کو نہ مانتا ہو لیکن فکری حیثیت سے غیر تربیت یافتہ دماغوں کو اس طرف آمادہ کرنا چاہتا ہو کہ وہ اُسے خدا مان لیں. عام انسانی عقلیں "الہیاتی تصورات" کے ادراک میں بہت ہی درماندہ ہوتی ہیں۔ ان کے پست افہام سے زیادہ قریب یہی ہے کہ "خدا مجسم" ہو مادہ اور مادیات سے بالکل ہی منزہ خدا کا عقیدہ انھیں دماغوں میں سما سکتا ہے جن کی بصیرت کی آنکھوں میں حکمت و فلسفہ نے سرمہ لگایا ہے. عام عقلوں کے لئے تو اس عقیدۂ تنزیہ کا سمجھنا بہت ہی دشوار ہے اس کے سمجھنے میں بڑے بڑے ٹھوکریں کھا چکے ہیں.

ایسی حالت میں اگر فرعون دوسرے لوگوں کو اس عقیدہ کی طرف لا کر اپنے کو خدا منوانا چاہتا ہو تو اس میں حیرت و تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس سلسلہ میں جو قرآنی الفاظ ہیں مثلاً لئن اتخذت الہا غیری لاجعلنک من المسجونین ان سے اسی مطلب کی تعیین نہیں ہوتی جو مودودی صاحب نے معین کرنا چاہا ہے کم سے کم قرآنی الفاظ میں تو دوسرے معنی کی گنجائش موجود ہے اور جبکہ "الہ" استعمال عرب میں معبود حق یعنی اللہ کے لئے مخصوص ہو گیا ہے تو مطلقاً معبود کے معنی میں یہاں استعمال کیونکر فرض کیا جا سکتا ہے، جب تک کہ یہ نہ واضح کر دیا جائے کہ "الہ" کا معبود بحق کے معنی کے لئے استعمال میں مخصوص ہو جانا نزول قرآن کے بعد کی چیز ہے۔

فاضل مودودی نے اس سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایران میں لفظ خدا بادشاہ کے لئے استعمال ہوتا تھا یعنی اللہ کے لئے نہیں۔ اس کے لئے "خدائے خدایگان" کا لفظ تھا۔ مجرد لفظ "خدا" کا استعمال بادشاہ کے لئے فارسی میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ لغت کی کتابوں میں لفظ خدا کی جو تشریح کی گئی ہے وہ اس استعمال کو "غیر اللہ کے لئے جائز نہیں قرار دیتی۔

صاحب ہفت قلزم لکھتے ہیں:۔

"خدا نام باریتعالی است مستجمع جمیع صفات و مخفف "خود آ" ہم است یعنی شخصے کہ خود آمدہ باشد"

ظاہر ہے کہ خود آنے والی ذات "واجب الوجود" ہی ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں بادشاہ کے لیے اس مجرد لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ایک انسان کو کچھ نادان اللہ، واجب الوجود اور خالق عالم سمجھ لیں اور اس کے لئے خدا کا لفظ استعمال کریں لیکن اس استعمال سے مودودی صاحب کا مقصد حاصل نہ ہو گا۔ البتہ خداوند کا لفظ بہت ہلکا ہے۔ اس کا استعمال بادشاہ کے لیے کیا معمولی رئیسوں کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا احتجاج

فاضل مودودی نے اپنے دعویٰ کے اثبات میں حسب ذیل آیت سے کام لیا ہے۔

"الم تر الی الذی حاج ابراہیم فی ربہ ان آتٰہ اللہ الملک اذ قال ابراہیم ربی الذی یحیی ویمیت۔ قال انا احی و امیت قال ابراہیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فأت بہا من المغرب فبہت الذی کفر۔" تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم سے حجت کی اس بارے میں کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ اور یہ حجت کیوں کی اس لیے کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت تو میرے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم نے کہا اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تو ذرا مغرب کی طرف سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔

فاضل مودودی نے اس آیت کا رخ اپنے نظریے کی طرف اس عنوان سے موڑا ہے "غور کیجیے۔ وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا۔ اس لیئے کہ وہ اللہ کا منکر نہ تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ کائنات کا فرمانروا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون تھا بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں اور خصوصاً ارض بابل کے باشندوں کا مالک کون ہے؟ وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ اس ملک کے باشندوں کا رب میں ہوں۔ حضرت ابراہیم سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے رب تسلیم کرو۔ میری بندگی اور عبادت کرو مگر جب حضرت ابراہیم نے کہا کہ میں تو اسی کو

رب مانوں گا اور اسی کی بندگی و عبادت بھی کروں گا جو زمین و آسمان کا رب ہے تو وہ حیران رہ گیا اور اس لئے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیونکر قابو میں لاؤں۔

فاضل مودودی کو کافر کے ہکا بکا رہ جانے کے متعلق اس قدر بعید تاویل کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔

اصل میں حضرت ابراہیم نے یہ مجادلہ احسنہ، جس شخص سے کیا ہے وہ صحیح معنوں میں اللہ کی ہستی سے واقف نہ تھا۔ اسرار الوہیت کی محرمی کا اسے شرف حاصل نہ تھا کہ وہ حکومت کے نشہ میں خدا کو بالکل بھلا چکا تھا۔ اس نے ابراہیم سے ان کے خدا۔ اللہ کے متعلق منکرانہ لہجہ میں سوال کیا حضرت ابراہیم نے جواب میں فرمایا کہ میرا خدا وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ تب معارضہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے (میں جس کو چاہوں ابھی ہلاک کر دوں اور جسے چاہوں ہلاکت سے بچا دوں پھر مجھے کیوں اللہ نہیں مانتے؟) اس متمرد نے حکومت کے نشہ میں حضرت ابراہیم کے استدلال کی متانت پر نظر نہیں کی تھی اور نہایت ہی بھونڈی بات، زبان سے نکال بیٹھا تھا۔ اس لئے فوراً خدا کے اس رسول نے جواب میں کہا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اگر تو واقعی اللہ ہے تو سورج کو مغرب سے نکال۔ چونکہ مخالف بہت ہی مہمل بات زبان سے نکال چکا تھا اور حضرت ابراہیم کا برجستہ جواب اس پر چپک کر رہ گیا تھا جس سے اس کے پاس نجات پانے کی صورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیئے لازمی طور سے اُسے ہکا بکا رہ جانا چاہیئے تھا۔ آیت کا اصل مطلب یہی معلوم ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کا مطلب اگر لیا جاتا ہے تو اس مقام پر اُس کافر کے ہکا بکا رہ جانے کی کوئی معقول وجہ نہیں نکلتی۔ وہ کافر حضرت ابراہیم کے جواب میں کہہ سکتا تھا کہ آپ کا جواب اصل بحث سے ربط نہیں رکھتا۔ میں اللہ کا تو منکر نہیں ہوں۔ ارض و سما اور شمس و قمر کا خالق تو وہی ہے۔ وہی ان کی گردشوں کا مالک ہے، میرے تصرف کا ہاتھ "خدا ہو خدا یگان" کے مخصوص اختیارات تک نہیں پہونچ سکتا، میں تو صرف تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنا رب قرار دو یعنی میری فرماں داری کرو۔

میرا حکم مانو میں تمہارا حاکم ہوں اللہ خالق السمٰوٰت والارض نہیں ہوں جو سورج کو مغرب سے نکالوں۔

کیا مودودی صاحب اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جس کافر کا یہ جواب اس منزل پر کافی نہیں تھا اور کیا حضرت ابراہیم کو اس جواب کے بعد سپر انداختہ نہ ہو جانا پڑتا۔ یہ سب خرابی کیوں ہے؟ محض اسلئے کہ معبودیت کے مخصوص نظریے سے مودودی صاحب مرعوب ہو گئے ہیں اور قرآنی مطلب کی تعیین اسی مرعوبیت کے ماتحت کر رہے ہیں۔

اسلام یقیناً تمام ممکنات اور ان کے مجموعہ کو ایک ایسی ہستی کے فیض رسانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود (خود آ) ہے یہی وہ ذات مستجمع جمیع صفات ہے جسے انسان کی عبادت و پرستش کا واحد مرکز قرار دیا گیا ہے۔ ہماری حقیقی اطاعت و فرمان داری کا وہی آقائے کونین و مالک دارین مستحق ہے لیکن چونکہ وہ حکیم علی الاطلاق بھی ہے اس نے اس کائنات کو سائنٹفک نظام کا پابند کر دیا ہے اور وہ اس دنیا میں عام بد نظمی Anarchy کی حالت دیکھنا پسند نہیں کرتا اس لیے انسانوں کے "مدنی الطبع" ہونیکا پہلو بنظر رکھتے ہوئے اس نے دنیا میں اطاعت و فرمان داری کا حقدار دوسرے مخصوص انسانوں کو بھی قرار دیدیا ہے کیونکہ حیوانات کے ایسے گروہ میں جو ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر زندگی بسر کرتا ہے اطاعت و فرمان داری کے دایرے کو وسعت دینے کی ضرورت تھی بغیر اس کے تمدنی نظام باقی ہی نہیں رہ سکتا تھا تاہم اطاعت و فرمان داری کے دایرے کی یہ توسیع اور اس کے ماتحت ایک انسان کا دوسرے انسان کی فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرنا جس کام کا وہ اشارہ کرے اُسے بجا لانا جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا اور جہاں اس کا فرمان ہو اپنا سر بھی کٹوا دینا عمومی حیثیت سے اسلام ناپسندیدہ نہیں قرار دیتا کیونکہ اس اطاعت کا سرچشمہ اطاعت الٰہی کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔

مودودی صاحب کی غیر منطقیانہ روش

اگر مودودی صاحب اسلام کے احکام و اوامر پر نظر ڈالیں گے تو انھیں صاف نظر آئے گا کہ خطابات

کے بہاؤ میں وہ ذرا منطقی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں وہ خود غور فرمائیں کیا مردوں کو عورتوں پر "قوام" حاکم بنا کر عورتوں پر شوہروں کی اطاعت واجب نہیں کی گئی ہے اور کیا ان کی نافرمانی (نشوزہ) کی حالت میں مردوں کو سزا دینے تک کا حکم نہیں دیا گیا ہے؟ اسی طرح کیا باپ، استاد، محسن اور قائد جیش کی اطاعت کے احکام اسلامی شریعت میں موجود نہیں ہیں؟

میرا تو یہ خیال ہے کہ اسلامی تعلیم کے ان پہلوؤں پر نظر کرنے کے بعد جناب مودودی کے زیر بحث نظریہ کی علی الاطلاق تائید نہیں کی جا سکتی۔ اس نظریہ کی "منطقیانہ حد بندی" کی ضرورت ہے۔ انھوں نے جس عموم کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے وہ اسلام کے ان "معاشرتی و عائلی اصول" سے ٹکراتا ہے۔

اس مقام پر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے جس طریقہ سے آجکل کے موجودہ نظریات حکومت، برطانیہ و امریکہ کی جمہوریت، روس کی اشتراکیت وغیرہ کو مختلف "ارباباً من دون اللہ" کا حامل قرار دیا ہے اسی طریقہ سے ان کے بیان کردہ اسلامی نظام میں بھی "ارباب و الٰہ" کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ نظریات کے حامیوں کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اسی عنوان سے ارباب و الٰہ کا وجود ثابت کر کے ان نظریوں پر زبان طعن دراز کرنا حق بجانب ہے تو پھر مودودی صاحب کے مزعومہ اسلامی نظام کا دامن اس قسم کی نکتہ چینیوں سے کیونکر بچایا جا سکتا ہے اس مسئلہ پر دوسرے پہلو سے بھی نظر کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن میں خود باری تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"۔ (خدا کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو "اولی الامر" ہیں ان کی اطاعت کرو)

اس میں شک نہیں کہ اولوالامر کی تعیین میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے اولوالامر سے مراد خلفائے معصومین ہیں کوئی کہتا ہے اولی الامر سے مراد عام بادشاہ ہیں بعض کے نزدیک "اولوالامر

کے لیئے عادل ہونے کی شرط ہے اور بعضوں کے نزدیک ظالم و فاسق بھی" اولوالامر ہو سکتے ہیں۔ گو وضح طور سے یہ معلوم نہیں کہ جناب مودودی کا اولوالامر کے بارے میں کیا مسلک ہے تاہم "اسلام کے نظریہ سیاسی" میں انھوں نے اسلام کا جو نظریہ حکومت پیش کیا ہے اس پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اولوالامر سے مراد ان کے نزدیک خلفائے معصومین نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں وہ کوئی مسلک اختیار کریں تاہم یہ نتیجہ بہرحال نکلے گا کہ جس طرح سے دوسرے نظریات حکومت میں انھیں "ارباب الٰہ" کا پتہ چل گیا اسی طریقہ سے اسلام میں بھی ان کے موعوعہ ارباب الٰہہ کا وجود موجود ہے۔ انبیا کی اطاعت کو چھوڑیئے۔ اولوالامر و امرائے جیش کی اطاعت انھیں "ارباب الٰہہ" کی تخلیق تک منجر ہوگی جس سے مودودی صاحب بچنا چاہتے تھے۔

یہ بحث کہ چونکہ اطاعت و فرماں برداری کے دائرے کی یہ توسیع اسی خالق ارض و سما کے منشا کے مطابق ہوتی ہے اس لیئے وہ انھیں کی اطاعت و فرماں برداری ہے مفید مطلب نہیں۔ یوں تو اشتراکیت و جمہوریت کے حامی بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ارباب و الٰہہ کی جس تخلیق سے آپ بیزار ہیں اور ہمارے نظریوں کو ان کا ذمہ دار بتا رہے ہیں اُن کی اطاعت بھی اپنے ہی قوانین و اصول کی اطاعت ہے ہم دوسرے انسانوں کی حقیقت میں اطاعت نہیں کر رہے ہیں بلکہ اُن قوانین و اصول کی اطاعت کر رہے ہیں جنھیں ہم نے خود عقل اور برسوں کے تجربہ کی مدد سے بنایا ہے۔ اس لیئے آپ جن کو ہمارے ارباب الٰہہ بتا رہے ہیں وہ کسی مذموم معنی میں ہمارے "ارباب و الٰہہ نہیں ہیں۔ انسانی سماج میں کچھ لوگوں کو اس قسم کے اختیارات ملنا بالکل مطابق فطرت ہے۔ ان اختیارات کے ملنے سے وہ "ارباب الٰہہ" حقیقتاً نہیں بن جاتے۔

مودودی صاحب کا تصور ریاست اسلامیہ | سطور بالا میں جس اصل اصول پر نظر کی گئی تھی جو فاضل مودودی کے خیال میں اسلام کے نظریہ سیاسی

کی بنیاد ہے۔ ذیل کی سطروں میں جناب مودودی کے بیان کردہ نظریہ کا جائزہ لینا ہے۔ مودودی صاحب نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے "اسلامی اسٹیٹ کی تشکیل جو قرآن کی مذکورہ بالا تصریحات سے نکلتی ہے یہ ہے :۔

(۱) کوئی شخص خاندان طبقہ یا گروہ بلکہ اسٹیٹ کی ساری آبادی مل کر بھی حاکمیت کی مالک نہیں ہے حاکم اصلی صرف خدا ہے اور باقی سب محض رعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲) قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ سارے مسلمان ملکر بھی نہ اپنے لئے کوئی قانون بنا سکتے ہیں اور نہ خدا کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ترمیم کر سکتے ہیں۔

(۳) اسلامی اسٹیٹ بہر حال اس قانون پر قایم ہوگی جو خدا کی طرف سے اس کے نبی نے دی ہے اور اس اسٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو"

مودودی صاحب نے اسلامی اسٹیٹ کی جو ابتدائی خصوصیتیں بیان کی ہیں وہ اپنی اجمالی صورت میں یقیناً قابل تسلیم ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حاکمیت کا اصلی مالک خدا ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس کے بنائے ہوئے کسی قانون میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتا اور یہ بھی درست ہے کہ اسلامی اسٹیٹ اسی قانون پر قایم ہوگی جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے اور اس اسٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔ یہاں تک تو کوئی خاص دقت نہیں ہے دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے عملی شکل دیجائے قرآن مجید میں تمدنی، معاشرتی، اقتصادی و انتظامی امور کے متعلق کچھ اساسی اصول بیان کر دیئے گئے ہیں، عملی زندگی میں پیش آنے والی ضرورتوں کے سلسلہ میں ان اساسی اصولوں سے احکام و مسایل کے اخذ و تفریع کی حاجت قدم قدم پر پڑے گی ادھر ہیں سے اختلافات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مسایل و احکام کے اخذ و تفریع کی ذمہ داری مودودی صاحب کی خواہش کے

مطابق عام مسلمانوں میں سے ہر اس شخص کے سپرد کر دینے کے بعد بھی جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہونچائی ہو اس اختلاف سے نجات کی صورت نہیں نکلتی۔ ایسی حالت میں اسکی تعیین میں پھر جھگڑا رہے گا کہ واقعاً قانون الٰہی کیا ہے؟ کیا ایسا ممکن نہیں کہ جن لوگوں کو اسٹیٹ چلانے کی ذمہ داری مل گئی ہے وہ اپنے منشا کے مطابق کچھ ایسے مجتہدین بہم پہونچالیں جو ان مجمل اساسی اصولوں سے اخذ و استنباطِ احکام برسرِ اقتدار جماعت کے حکومتی اغراض کو تقویت پہونچانے کی غرض سے کریں۔ کچھ دیانت دار لوگ خواہ کتنا ہی ان سے اختلاف کرتے رہیں لیکن وہ اس غلط مقصد کے تحت اخذ کئے ہوئے احکام کو نافذ کر کے اسی کا دعویٰ کرتے رہیں کہ ہم خدا کا قانون ہی نافذ کر رہے ہیں اور اس طرح اُن مصیبتوں میں آپ بھی گرفتار ہیں جن میں آپ کے خیال کے مطابق وہ ممالک مبتلا ہیں جو آج جمہوریت اشتراکیت وغیرہ کے نقیب ہونے کے مدعی ہیں۔ اگر اسلامی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اس احتمال پر نظر کی جائے گی تو اس میں واقعیت نظر آئے گی۔ کیا اب سے پہلے اسلامی تاریخ میں "شخصی طبقاتی فوائد" حاصل کرنے کیلئے قوانین نہیں بنائے گئے؟ کیا اس سلسلہ میں "دولت علم اور جھوٹے پروپیگنڈے" کے زور سے لوگوں کو بیوقوف نہیں بنایا گیا؟

حکومت کی مسند

اصل یہ ہے کہ حکومت کی مسند پر بیٹھ کر انسانی دماغ کا متوازن رہنا بہت مشکل ہے انسانی کمزوریاں مختلف گوشوں سے اس کے عقل کی دنیا تباہ کرتی رہتی ہیں یہ سمجھنے کی بات ہے کہ اس نظریہ سے کہ درحقیقت یہ حکومت اللہ کی ہے جو اس کے خلفا نے شخص متعلق کی ذات میں مرتکز کر دی ہے عملی زندگی میں کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچتا خود غرض انسان اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کیلئے ان چیزوں کی پروا نہیں کرتا۔ مختلف راستوں سے وہ اس مسند تک پہونچ جاتا ہے اور پھر اُسے اپنے اور اپنے مخصوص اقارب و احباب کے لیے مخصوص کر لینے کے واسطے نہ معلوم کیا کیا طریقے سوچتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے۔ عملی زندگی کا تجربہ یہی ہے کہ خدا کی قہاریت و جباریت سے یہ لوگ ہچکچاتے نہیں، جو کچھ انہیں کرنا ہوتا ہے اسی کے نام سے انجام دیتے ہیں۔

انتخاب حاکم

مودودی صاحب نے دلچسپ استدلال سے خدا کا خلیفہ ہر مومن کو بنا دیا ہے اور اس کا حق دیا ہے کہ وہ بہترین شخص کا انتخاب کرے۔ اس عمل سے اگرچہ ہر مومن کے جذبۂ خود پسندی کی تسلی تو ضرور ہو گی لیکن حقیقتاً عملی زندگی میں اس سے کوئی فایدہ حاصل نہ ہو گا۔ مودودی صاحب نے اسکے انتخاب کے سلسلہ میں یہ لکھا ہے:-

"امیر کا انتخاب ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کے اصول پر ہو گا یعنی عام مسلمان جس کے کیرکٹر پر پوری طرح اعتماد رکھتے ہوں وہی اس منصب کے لیے چنا جائے گا اور جب وہ چن لیا جائے گا تو اسکو سیاہ و سپید کے اختیارات ہوں گے۔ اس پر پورا بھروسا کیا جائے گا جب تک وہ خدا و رسول کے قانون کی پیروی کریگا اس کی کامل اطاعت کی جائے گی"

انتخاب کے متعلق جو شرطیں لگائی گئی ہیں وہ عملی زندگی میں برائے بیت ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس نوعیت کی شرطیں انتخاب کے مواقع پر کس نظام میں نہیں لگائی گئی ہیں۔ مگر دشواری تو یہ ہے کہ مودودی صاحب نے اس طریق انتخاب کی جڑ پہلے ہی سے کاٹ دی ہے۔ وہ موجودہ جمہوریتوں پر اعتراض کرتے ہوئے یہ فرما چکے ہیں

"پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا۔ اس کا فیصلہ عموماً یک طرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے، بلکہ بسا اوقات عقلی و علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو جاتی ہے اس کو بھی وہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے"

انصاف فرمائیے کہ جب خود آپ کی نگاہ میں عام لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے تو ان "تمام خلفاء" سے جو آپ کی توسیع کی بنا پر عامۃ الناس ہی کی حد میں آتے ہیں اسکی

امید کیونکر رکھی جا سکتی ہے کہ ان کا فیصلہ "انتخاب امیر" کے بارے میں صحیح ہوگا۔ وہ آپ کے خیال کے مطابق خلافت کے عہدے کے فرداً فرداً اہل سہی تاہم آپ کی اس عزت افزائی سے ان کی دماغی حالت اور فطری کمزوری عام انسانوں کے مقابلہ میں بدل نہیں جاتی۔

مودودی صاحب کے طرز استدلال میں یہ بڑا نقص ہے کہ وہ دوسروں پر جو اعتراض فرماتے ہیں اپنے نظام کی بنیاد رکھتے وقت اس کا بالکل لحاظ نہیں فرماتے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسلامی اسٹیٹ کی جس نظریہ کی اساس رکھی ہے اس کی منطقی چولیں درست نہیں ہیں۔ وہ صرف متضاد خیالات وافکار کا مجموعہ ہے۔ امیر کے اختیارات کے دائرے کو مودودی صاحب نے یہ لکھ کر بہت وسیع کر دیا ہے۔

"عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کی رائے کے مقابلہ میں برحق ہو اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی طرف قلت ہے اور باطل کو اس لئے اختیار کیا جائے کہ ایک جم غفیر اس کی تائید میں ہے لہذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ اور امیر کو یہ بھی حق ہے کہ پوری مجلس سے اتفاق کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے"

جب امیر کو یہ حق ہو گیا کہ خواہ وہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ یا یہ کہ پوری مجلس سے اتفاق کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے تو اب اور وہ کون سا عنصر باقی رہ گیا جس سے Dictation (آمر) کی تعمیر ہوتی ہے؟ یہ سب باتیں تو آمر ہی کی تخلیق کی طرف لے جانے والی ہیں ہٹلر، مسولینی وغیرہ کی پیدائش انھیں امور کی مرہون منت تھی۔ ان ڈکٹیٹروں کے ہاتھ میں ان اسلحہ کے سوا اور کون سا سلاح جنگ تھا؟ اسی کے بل بوتے پر ان کی قہرمانی سطوت قائم تھی اور وہ انسانی تہذیب و تمدن کیلئے صاعقۂ جہاں سوز بنے ہوئے تھے۔ مودودی صاحب اس عنوان سے منتخب ہونے والے امیر کو اتنا زبردست حق دے کر اسلامی نظام کو نازیت و فسطائیت وغیرہ کے شعلوں میں لپیٹ رہے ہیں اور اس طرح انسانیت کی تباہی کا

سامان کچھ اور بڑھا رہے ہیں۔

حیرت تو یہ ہے کہ مودودی صاحب نے نازیت و فسطائیت و اشتراکیت سے کافی بیزاری کا اظہار کرنے کے بعد اپنے اسلامی نظام کا خاکہ تیار کرنے میں انھیں نظریوں سے کام لیا ہے، اور منطقی نظم کا لحاظ کئے بغیر "جمہوریت و آمریت" کا ایک ایسا مرکب بنا ڈالا ہے جو عملی زندگی میں کوئی خاص افادیت نہیں رکھتا۔ مودودی صاحب نے سطور بالا کے بعد یہ سطریں ضرور بڑھائی ہیں۔

"مگر ہر صورت میں عامہ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقوی اور خوف خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے یا نفسانیت کے ساتھ۔ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسند امارت سے نیچے بھی اتار سکتی ہے۔"

یہ شرط عملی زندگی میں ذرا بھی مفید ثابت نہ ہوگی۔ کیا اس سے ملتی جلتی شرطیں دوسرے نظریوں میں نہیں ہیں اور کیا ان شرائط کے باوجود نازیت و فسطائیت کی بدولت انسانی زندگی آفتوں اور مصیبتوں کے خوفناک شکنجے میں گرفتار نہیں رہی ہے۔ علاوہ بریں اس کا فیصلہ بھی تو عوام الناس ہی کے ہاتھ میں ہے جن کے دل و دماغ کے متعلق مودودی صاحب خود ہی مخالف سرٹفکیٹ دے چکے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ عوام اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ امیر اپنے یہ وسیع اختیارات تقویٰ اور خوف خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے یا نفسانیت کے ساتھ؟ انھیں حکومت کی مشینری بہت آسانی سے دھوکے میں رکھ سکتی ہے اور ذاتی منفعتوں کے چمکیلے کھلونوں سے انھیں بہلا سکتی ہے، دشواری یہ ہے کہ جناب مودودی اسلامی تاریخ کے پس منظر میں ان امور کی زحمت نہیں فرماتے۔

مودودی صاحب کے اسلامی نظریہ کی مزعومہ نوعیت

جناب مودودی صاحب نے اسلامی اسٹیٹ کی ابتدائی خصوصیات بتاتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

"ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ جمہوریت نہیں ہے اسلئے کہ جمہوریت تو

نام ہی اس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے باشندوں کو حاکمیت حاصل ہو۔ انھیں کی رائے سے قوانین بنیں اور انھیں کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو جس قانون کو وہ چاہیں وہ نافذ ہو اور جسے نہ چاہیں وہ کتاب آئین سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے لہذا اس معنی میں اُسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لئے زیادہ صحیح نام "الہی حکومت ہے" جسکو انگریزی میں Theocracy کہتے ہیں، مگر یورپ جس تھیوکریسی سے واقف ہے اسلامی تھیوکریسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیوکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ Priest class خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قانون نافذ کرتا ہے اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے، بخلاف اس کے اسلام جس تھیوکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ عام مسلمان اُسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلعم کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو Theodemocracy یعنی "الہی جمہوریت" کے نام سے موسوم کروں گا کیونکہ اس میں خدا کو حاکمیت عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ یعنی executive مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے اور الہی قانون جہاں تعبیر طلب ہو گا وہاں کوئی مخصوص نسل یا طبقہ نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہو گا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔"

عبارت بالا میں فاضل نکتہ رس نے اسلامی اسٹیٹ کے متعلق بہت سی تصریحات کی ہیں جو قابل بحث ہیں۔

مودودی صاحب کے نظریہ کے متعلق پہلا سوال | اسے پڑھ کر سب سے پہلا سوال جو پیدا ہوتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ اسلام کی جو ابتدائی خصوصیات قرآن کی تصریحات سے آپ نے نکالی ہیں اور جنھیں ماسبق میں کسی جگہ بعینہٖ نقل کر دیا گیا ہے اُن سے یہ امور کیونکر اخذ ہوتے ہیں کہ اسلامی اسٹیٹ میں عاملہ یعنی executive مسلمانوں کی رائے سے بنے گی اور سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جنکے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہونگے؟ پھر غور فرمایئے کہ ان ابتدائی خصوصیات اور ان امور کے مابین کوئی ایسا لزوم نہیں ہے جو ہمیں اس پر مجبور کر دے کہ ان خصوصیات کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم انھیں نتائج تک پہونچیں ممکن ہے مودودی صاحب کے نزدیک ان نتائج کا ماخذ دوسرے خارجی اصول ہوں تو ایسی حالت میں ضرورت تھی کہ ان کا تذکرہ کیا جاتا تاکہ اُن پر غور کا موقع ملتا۔

میں تو پھر ادب سے یہی عرض کروں گا کہ اُن مذکورہ بالا ابتدائی خصوصیات اور آپکی تراشی ہوئی صفات democracy میں کوئی منطقی لزوم نہیں ہے۔ یہ مان کر کہ حاکم اصلی صرف خدا ہے اور قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہیں اور یہ کہ اسلامی اسٹیٹ بہر حال اس قانون پر قائم ہوگی جو خدا کی طرف سے اس کے نبی نے دی ہے ہم دوسرے "نظریات ریاست" کی عمارت بھی تعمیر کر سکتے ہیں جو مودودی صاحب کے اسلامی اسٹیٹ کے تخیل سے بالکل ہی متضاد تخیل پر قائم ہوں اور بالکل اسی عنوان سے جس طرح کہ مودودی صاحب نے اپنی "الٰہی جمہوری حکومت" کی بنیاد رکھی ہے۔

مودودی صاحب کے نظریہ کے متعلق دوسرا سوال

اس کے ماسوا دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عوام کے متعلق آپ بار بار یہ فرما رہے ہیں کہ یہ لوگ اپنے مفاد نہیں سمجھتے ان کے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ ان کی راؤں پر جو زیادہ تر جذبات وخواہشات کا نتیجہ ہوتی ہیں اعتماد نہیں کیا جا سکتا تو پھر کس منطق کی بنا پر آپ اسلامی نظام میں یہ خطرناک عناصر بڑھاتے ہیں کہ اس میں "عاملہ" مسلمانوں کی رائے سے رہے گی۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جنکے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہونگے۔ اس طریقہ سے تو آپ

اختیارات کا بڑا حصہ انھیں عوام کو دے رہے ہیں جنکے متعلق آپ خود بے اعتمادی کا اظہار فرما چکے ہیں اور لطف یہ ہے کہ عوام کا یہ اختیار امیر کے اس اختیار سے متصادم ہوتا ہے جس میں اُسے اقلیت اور اکثریت کے فیصلہ کے برخلاف عمل کرنے کا حق مودودی صاحب دے چکے ہیں فرض کیجیے کہ کسی انتظامی معاملہ میں عامہ مسلمین کی ایک رائے ہے لیکن امیر اس سے متضاد رائے رکھتا ہے۔ مودودی صاحب کا بیان فرمان یہ ہے کہ سارے انتظامی معاملات مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہونگے لیکن دوسری جگہ امیر کو اپنی رائے پر عمل کرنے کا حق دے چکے ہیں۔ ریاست کے بنیادی تخیل میں مودودی صاحب کا یہ فکری تضاد" بہت ہی دلچسپ ہے۔

اسلامی ریاست کا مقصد

جناب مودودی نے اسلامی اسٹیٹ کا مقصد بتاتے ہوئے تحریر فرمایا ہے "اس دستور کی حدود کے اندر جو اسٹیٹ ہے اُس کے لیئے ایک مقصد بھی خدا نے معین کر دیا ہے اور اس کی تشریح قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے مثلاً فرمایا ہے "**لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط**" "ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت کیساتھ بھیجا اور اُنکے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قایم ہوں الخ۔ اس آیت کے بعد مولانا نے دوسری آیتیں درج کر کے ارشاد فرمایا ہے "ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس اسٹیٹ کا تخیل پیش کر رہا ہے اسکا مقصد محض سلبی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اسکا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے۔ اُن کی آزادی کی حفاظت کرے اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے بلکہ اسکا مدعا اجتماعی عدل کے اُس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے اسکا مقصد بدی کی اُن تمام شکلوں کو مٹانا اور نیکی کی اُن تمام صورتوں کو قایم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے"

اس بیان کے چند سطور بعد ہی یہ ارشاد ہوا ہے :-

"اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دایرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے اس کا دایرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریے اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیوٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاسسٹی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس کلیت کے باوجود اس میں موجودہ زمانہ کی کلی Totalitarian اور استبدادی Authoritarian حکومتوں کا سا رنگ نہیں ہے۔ اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قایم کیا گیا ہے اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قایم کی گئی ہیں انھیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل بے اختیار گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کر سکتا ہے۔"

جناب مودودی کے افادات بالا کے سلسلہ میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر رسل سے مراد فرشتے نہ بھی لئے جائیں تب بھی آیت مذکورہ کا رخ عمومی ہے خصوصی نہیں ہے۔ اس میں جناب محمدؐ کی تخصیص نہیں کی گئی ہے بلکہ تمام رسولوں کے مقصد رسالت کا تذکرہ کیا گیا ہے **لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت** "ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایتوں کے ساتھ بھیجا۔ ایسی صورت میں اگر اس آیہ کے مفہوم کو اسٹیٹ کے تخیل سے وابستہ بھی فرض کر لیا جائے تو وہ تمام رسولوں کے نظریۂ ریاست سے (اگر کہیں اسکا موجودہ معنی میں وجود ہے) بلا تخصیص مربوط ہوگا۔ جناب سرور کائناتؐ کے مقصد رسالت کے تصور سے اسے کوئی خاص ربط نہ ہوگا۔ اگر مودودی صاحب اس توضیح پر راضی ہو جائیں اور اس مقصد کو شریعت محمدیہ کے قایم کردہ نظریۂ ریاست سے مقصود نہ قرار دیں تو ہمیں اس توضیح پر نظری حیثیت سے تو کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ لفظ اسلام میں وہ عموم پیدا کیا جا سکتا ہے جو شریعت محمدیہ کے علاوہ دوسری شریعتیں بھی اپنے ضمن میں لے لیں لیکن اب بحث یہ ہوگی کہ آیا واقعا تمام رسولوں کی

تعلیم تمدن کے ہر شعبہ پر حاوی تھی اور کیا اُن کے عمل کا دائرہ حقیقتاً اتنا ہی ہمہ گیر تھا۔ یہ مسئلہ نظری حیثیت سے نہیں طے ہو سکتا۔ اس کے لیے تاریخی حقیقتوں کی طرف نظر کرنے کی ضرورت ہوگی۔ واقعات سے کیا پتہ چلتا ہے آیا حضرت عیسیٰ کا تبلیغی دائرہ اس قسم کی اسٹیٹ قایم کرنے پر مشتمل تھا؟ کیا انھوں نے تمدن کے ہر شعبہ کو اپنی تعلیم کے حلقہ میں لے لیا تھا؟ ان سوالات کا جواب جبتک واضح عنوان سے نہیں دیا جاتا اس وقت تک یہ بحث کسی نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتی۔

"اسلام کے نظریہ سیاسی" کے حاشیہ پر ایک جگہ مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے "عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں لہذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہہ کر انھیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں"۔

جناب مودودی کا اس جملے سے آخر کیا مطلب ہے کہ "پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں"

آیا اُن کا مطلب یہ ہے کہ مسیح کی تبلیغ ہی چند اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھی اسلیئے پادریوں کے پاس کوئی شریعت نہیں تھی؟ اگر ایسا ہے تو یہ امر مودودی صاحب کے اس خیال کے خلاف ہو جائیگا کہ تمام رسول ایک ہمہ گیر اسٹیٹ کے تخیل کا پھیلانا ہی پیش نظر رکھتے تھے یا پھر مودودی صاحب نے اس عبارت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مسیح نے ایک ہمہ گیر شریعت یا اسٹیٹ کا تصور دنیا کو دیا تھا لیکن وہ ضایع ہو گیا یا ضایع کر دیا گیا اور نتیجہ میں پادریوں اور عیسائی پاپاؤں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات رہ گئیں؟ اس صورت میں صرف اس دعوے سے کام نہیں نکلے گا ضرورت تھی کہ اسکے ثبوت میں جناب مودودی صاحب ایسے تاریخی شواہد مہیا فرما دیتے جو اس دعوے کو ثابت کر سکتے۔

اصل تو یہ ہے کہ مودودی صاحب نے آیہ مذکورہ کو مقصد اسٹیٹ سے بغیر کسی وجہ وجیہ کے مربوط فرمانے کی کوشش کی ہے سیدھی سادھی سی بات تو یہ ہے کہ اس میں رسولوں کا مقصد بعثت بتایا گیا ہے اور وہ نوع بشری میں عقلی و اخلاقی و معاشرتی مزاج صالح پیدا کرنا ہے۔ اس کے مختلف مظاہر ہیں۔ مختلف گوشے ہیں۔ مختلف پہلو ہیں جو کہیں یہ

مقصد کسی منظر میں نمایاں ہوتا ہے کہیں کسی منظر میں۔

اجتماعی عدل کی ترویج اور دوسرے نظام

پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ آپ نے اسلامی ریاست کا جو مقصد بتایا ہے یعنی اجتماعی عدل کے متوازن نظام کو رائج کرنا، وہ مقصد کس موجودہ نظام ریاست کا نہیں بتایا جاتا ہے۔ ہر نظام ریاست کا حامی یہی مقصد اپنے پسندیدہ نظام کا بتاتا ہے پھر اس مقصد کو بتا کر زیر بحث نظام کی برتری کیا ثابت ہوئی؟ دیکھنا یہ ہے کہ آیا آج تک یہ مقصد حاصل ہوا ہے یا آپ نے جو نظام بنایا ہے وہ عملی زندگی میں داخل ہو کر اس مقصد کی طرف رہنمائی کر بھی سکتا ہے؟ اور کہیں اس نظام میں بھی وہی رخنے تو موجود نہیں ہیں جن سے مختلف مفسدے اور فتنے داخل ہو کر انسانی سعادت کے حصول کو دوسرے نظاموں میں ناممکن بناتے رہے ہیں اور بنا رہے ہیں اسلام کے نظریہ سیاسی میں مسئلہ کے اس پہلو سے کہیں استدلالی بحث نہیں کی گئی ہے۔

استخلاف فی الارض کی بحث

جناب مودودی نے آیہ استخلاف سے استشہاد کرتے ہوئے بعض کانٹے کی باتیں اپنے نظریے کی تائید کے سلسلے میں بیان کی ہیں، ان سے اجمالی بحث ضروری ہے۔

مودودی صاحب کا ارشاد ہے:۔

آیہ استخلاف اسلام کے نظریہ ریاست (Political Theory) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے اس میں دو بنیادی نکات بیان کئے گئے ہیں پہلا نکتہ یہ کہ اسلام حاکمیت کے بجائے خلافت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے چونکہ اس نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمران ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ ہونا چاہیے جو محض تفویض کردہ اختیارات استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوسرے کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بنا دے گا بلکہ یہ کہا کہ ان کو خلیفہ بنا دے گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا نائب

اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں گفتگو سے پہلے آیۂ استخلاف کے مفہوم پر غور کرلینا مناسب ہے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔

اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا اسی طرح جس طرح ان سے پہلے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت سلف سے اسلام کے مختلف فرقوں کے مابین اختلاف کا آماجگاہ بنی ہوئی ہے لیکن مجھے یہاں اس آیت سے لپٹے ہوئے مختلف مناظرانہ مباحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں جو کچھ گفتگو کرنا ہے وہ عام اسلامی نقطۂ نظر سے ہے، اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ آیۂ استخلاف کے بارے میں مختلف مذاہب کے رجحانات خصوصی کیا ہیں؟

جناب مودودی نے اس آیۂ شریفہ سے جو "کانٹے کی بات" اخذ کی ہے اصل میں وہی قابل غور ہے ہمیں اسی پر نظر کرنا ہے کہ "سب مومن خلافت کے حامل کیونکر ہو گئے اور پھر انھیں اس کا حق کیونکر حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے اختیارات خلافت بذریعۂ انتخاب ایک شخص میں مرتکز کردیں؟

پہلی بات پہلی بات اس ضمن میں قابل بحث یہ ہے کہ جناب مودودی نے جو استنباط اس آیہ سے فرمایا ہے اسکی تائید تاریخی شہادتوں سے کس حد تک ہوتی ہے؟ مودودی صاحب نے اس آیہ کا ترجمہ یہی تو کیا ہے کہ "اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنادے گا اسی طرح جس طرح ان سے پہلے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا"! اسکے معنی یہ ہوئے کہ پہلے بھی خدا نے خلیفہ بنائے ہیں اور اب بھی اسی طرح سے خلیفہ بنائیگا۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ کے اس عمومی مفہوم کا مصداق انبیاء و ان کے نائبین بہر حال ہوں گے کیونکہ ان میں سے کوئی براہ راست خدا کا مسلمہ طور پر قایم مقام ہے یعنی انبیاء و مرسلین اور کوئی انکے واسطہ سے جیسے دوسرے ائمہ و اوصیاء و خلفاء۔ انھیں خلافت انبیاء و مرسلین کی نیابت سے حاصل ہوتی ہے۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ مودودی صاحب کے اس "کانٹے کی بات" پر کسی زمانہ میں بھی عمل ہوا ہے؟ کوئی نبی کوئی امام، کوئی نبی کا جانشین اس زمانہ کے "مومنین و مومنات" کے ووٹوں سے منتخب ہوا ہے؟ دوسرے لفظوں میں مودودی صاحب کے بنائے ہوئے تمام خلفائے آیا اپنے اختیارات خلافت بذریعۂ انتخاب ان اشخاص میں مرکوز کیئے ہیں؟ ہمیں تو کوئی ہلکی سی بھی تاریخی شہادت کسی دور میں بھی اس "کانٹے کی بات" کی تائید میں نہیں ملتی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

شاید مودودی صاحب کی طرف سے کہا جائے کہ اس طرح خلیفہ کے انتخاب کا شرف آخر الامم کو بخشا گیا ہے لہذا اس طریقہ انتخاب کی تائید میں سابق کی تاریخ سے شہادتیں ڈھونڈھنا لاحاصل ہے۔ اس امت کے لوگ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے یکساں طور پر خلفا قرار دیئے گئے ہیں۔ سابق کی امتوں کو یہ شرف حاصل نہ تھا لیکن اول تو الفاظ قرآنی اس تشریح کے متحمل نہیں ہیں۔ وہ صاف طور سے یہ بتا رہے ہیں کہ جس طرح سابق میں خلیفہ بنائے گئے تھے اسی طرح اب خلیفہ بنائے جائیں گے۔ اس مقام پر لفظ "کما"، "جس طرح" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ قابل دریافت یہ امر ہے کہ خود اس "خیر الامم" میں انتخاب خلیفہ کا کیا طریقہ رہا ہے؟ سب سے بڑے خدا کے خلیفہ تو خود سرور کائنات ہیں۔ انھیں کن مومنین و مومنات نے منتخب کیا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ رسولؐ کی بعثت تو پہلے ہو چکی ہے اس آیت کے نزول کے بعد انتخاب خلیفہ کا یہ قاعدہ جاری ہوا ہے اور اس "کانٹے کی بات" پر عمل ہوا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ تاریخ اسلامی اس "کانٹے کی بات" پر ٹکنے کیلئے آمادہ نہیں دکھائی دیتی۔ ہم رسولؐ کو اس انتخابی قاعدے کی زد سے علیحدہ کئے لیتے ہیں اور صرف سواد اعظم کے نقطۂ نظر سے ان کے خلفا کے انتخاب پر نظر کرتے ہیں تب بھی اس "کانٹے کی بات" کی تائید نہیں ملتی۔

سواد اعظم کی مزعومہ "خلافت راشدہ" کے سلسلے کی پہلی خلافت میں ضرور کسی نہ کسی درجے انتخاب سے کام لیا گیا ہے لیکن وہ انتخاب بھی اس کانٹے کی بات پر پورا نہیں اترتا ہیں بالفعل اس بحث

maaplib.com

تعلق نہیں کہ اس انتخاب میں کتنے مومنین نے حصہ لیا لیکن مودودی صاحب کے "کانٹے کی بات" مکمل کرنے کیلئے مومنین کا حصہ لینا ہی تو کافی نہیں "مومنات" کا شریک ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ انھوں نے صاف صاف فرمایا ہے "ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہئیے اس لیئے کہ وہ خلافت کا حامل ہے"

اب تاریخ سے اس کا جواب دیا جائے کہ اس انتخاب میں کن مومنات نے حصہ لیا تھا؟ اور سقیفۂ بنی ساعدہ میں جہاں یہ انتخاب ہوا تھا وہاں کتنی "مومنات" موجود تھیں۔ اور آیا واقعاً انھیں حق والے دھندگی کے استعمال کا اُس زمانہ میں صنفی حیثیت سے اہل بھی سمجھا جاتا تھا؟ اگر اس سلسلہ کی پہلی کڑی میں یہ سب تسلیم کر لیا جائے تو پھر دوسری تیسری اور چوتھی خلافت کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ ان میں کیوں اس "کانٹے کی بات" پر عمل نہیں کیا گیا اور کیوں مودودی صاحب کے وہ تمام مومنین و مومنات جنھیں انھوں نے خلیفہ بنایا ہے نظر انداز کئے گئے؟

دوسری بات آیۂ مذکورہ کے جو الفاظ ہیں اُن سے خود جناب مودودی کے اس نظریہ کی تائید نہیں ہوتی کہ جمیع "مومنین و مومنات" اپنی اپنی جگہ پر خدا کے خلیفہ ہیں۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں اس آیۂ سے متعلق ایک سوال و جواب لکھا ہے جس سے مودودی صاحب کے نظریہ کے تار و پود کی کمزوری اور واضح ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

فان قیل الآیۃ متروکۃ الظاہر لانہا تقتضی حصول الخلافۃ لکل من امن وعمل صالحاً ولم یکن الامر کذلک والجواب ان کلمۃ من للتبعیض فقولہ منکم یدل علی ان المراد بہذا الخطاب بعضہم۔

پس اگر کہا جائے کہ یہ آیت ظاہر پر محمول نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا ظاہر تو یہ چاہتا ہے کہ خلافت ہر اس شخص کو حاصل ہو جو ایمان لایا ہے اور اس نے عمل صالح کئے ہیں لیکن صورت حال اسکے خلاف ہے تو اسکے جواب میں یہ کہا جائیگا کہ "منکم" میں کلمہ من تبعیض یعنی بعضیت کیلئے ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں

خطاب کی حیثیت عمومی نہیں رہتی بلکہ خصوصی ہو جاتی ہے مطلب یہ ہوا کہ خلافت کا وعدہ اُن تمام لوگوں سے نہیں کیا گیا ہے جو مومن اور صاحب اعمال صالحہ ہیں بلکہ ان میں سے مخصوص افراد سے وعدہ ہے۔

امام رازی نے جس معترض کا قول نقل کیا ہے اس نے مودودی صاحب سے زیادہ تاریخ پر نظر رکھی ہے اس لئے اُسے یہ خیال کہ تمام مومنین خلیفہ قرار دیئے جائیں بالکل ہی فضول اور مہمل معلوم ہوا اور اس نے اس احتمال کو اپنا مسلک نہیں بتایا اور اس احتمال کو بے معنی ہونے کی وجہ سے اسنے آیت کو متروک الظاہر قرار دینا چاہا حالانکہ مِن کی تبعیضیت پر اگر نظر کر لی جاتی تو بقول امام رازی کوئی دقت پیش نہ آتی، اگر مودودی صاحب استخلاف فی الارض کا مطلب یہ لے لیں کہ اُس نے انھیں زمین پر ساکن بنایا اور اس کے تصرف پر قدرت دی تو اس حالت میں تاریخ سے چشم پوشی کا الزام تو عاید نہیں ہو گا مگر یہ بحث باقی رہ جائے گی کہ آیت مقام بشارت میں ہے اور سکونت ارض کی حیثیت تو غیر مومنین کو بھی حاصل ہے پھر اس حالت میں مومنین کی خصوصیت کیا باقی رہ جاتی ہے۔

اسی طرح اگر ایمان وعمل صالح کی قیدوں میں غیر معمولی تنگی پیدا کر لی جائے کہ وہ چند ہی افراد میں دائرہ ہو کر رہ جائے تب بھی ان اعتراضات سے مودودی صاحب کو نجات نہیں ملے گی۔ اول تو جو اُن کا مقصد توسیع سے تھا وہ قطعی فوت ہو جائیگا کیونکہ پھر انتخاب کا حق چند اخص الخواص افراد میں منحصر ہو کر رہ جائے گا اور دوسرے عام مساوات کا مودودی تخیل تباہ ہو جائے گا۔

سوانح چہاردہ معصومین علیہم السلام

مکمل سٹ اردو	قیمت ۱۲	محصول ڈاک	۹/
″ ″ انگریزی	″ ۸	″	۹/

ملنے کا پتہ سکریٹری امامیہ مشن نخاس لکھنؤ

پبلشر۔ مرزا حیدر حسین۔ اسسٹنٹ سکریٹری امامیہ مشن۔ لکھنؤ